中國詩選

چینی نظمیں



ابن انشا

قیمت P[redacted]Rs. 4.50

بار اول - - نومبر ۱۹۶۰

مطبع - - نقوش پریس

لاہور اکیڈمی۔ لاہور

یہ تو سچ ہے نہ کچھ بات جی کی بنی
سُونی راتوں میں دیکھا کیے چاندنی
پر یہ سوَدا ہے ، ہم کو پُرانا سجن
اور جینے کا اپنے بہانا سجن ؟

تقریب

سنہ ۱۹۴۹ء میں بھادوں کا مہینہ تھا کہ حالات کی آندھی مجھے لاہور سے اُٹھا کراچی لے آئی۔ نیا شہر، نئے لوگ، رین بسیرا — شہر سے دور ایک پرانے اسپتال کی خستہ و خراب بارک مقرر ہوئی جو مریضوں کے کام کی نہ رہی تھی۔ عجیب آسیبی سا ماحول تھا۔ دودکشوں میں سے ہوا چیختی سیٹیاں بجاتی گزرتی۔ احاطہ نیم اور بکائن کے پیلے اُدھ پیلے پتوں سے پٹا رہتا۔ رات کو گورا قبرستان کی طرف کتے نوحے الاپتے اور پاس کے فوجی کیمپ کا گھڑیال ساعت بہ ساعت پہرے دار کی موگری سے جھنجنا اُٹھتا۔

تنہائی اور اداسی کا حصار توڑنے کے لئے آخر ایک شب میں نے پرانے جزدانوں کی سیر شروع کی۔ انہی میں ملگجے اوراق کا یہ شیرازہ یعنی چینی نظموں کے ترجموں کا مسودہ تھا جس کی ترتیب و تہذیب مصروفیتوں کے کارن رکی ہوئی تھی۔ لخت لخت کو سمیٹنے چھانٹنے نظم کرنے میں مہینوں لگ گئے لیکن بہرحال کام انجام کو پہنچ گیا۔ جاڑے گزرتے، چیت آنے تک اچھا خاصا دفتر تیار تھا۔

تھا تو یہ اپنے شوق کا کارخانہ لیکن متفرق نظمیں ادبی پرچوں میں چھپیں تو لوگ متوجہ ہوئے۔ ایک ناشر نے فرمائش کی کہ کتاب بنا دو۔ یہ تھوڑا کام نہیں تھا — لاہور جاکر دوبارہ متنوں سے ترجموں کا موازنہ کیا۔ صفائی اور منجھائی کی طرف اور توجہ دی۔ چینی شاعری کا خاکہ مرتب کیا اور مصنفوں کے حالات جمع کئے۔ مختار صدیقی

میرے مہربان دوست نے دیباچہ تک لکھ دیا اور اس میں نکتہ رسی کا حق ادا کیا۔ ہونہار آرٹسٹ مقصود نے ہر نظم کی آرائش کے لئے دلاویز نقوش رسم کئے جن میں واقعی چین قدیم کی رُوح کھینچ آئی تھی۔ لیکن میں، میرا کاتب، میرا نفیس مزاج طابع اور ناشر سبھی جلد بازی سے نفور تھے اور اس مقولے کے قائل کہ جو کام کل پر ڈالا جا سکتا اسے آج کیوں کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۵۹ء آگیا، پر کتاب نہ آئی۔ اس دیر سے بڑا نقصان ہوا۔ بعض مسودے کراچی اور لاہور کے بار بار سفر میں آوارہ گرد ہو گئے۔ اب جو میں ڈھونڈتا ہوں تو کتابت کے پیلے اوراق تو ملتے ہیں لیکن نہ میرے پیش لفظ کا کہیں نشان ہے نہ مختار صدیقی کا دیباچہ دستیاب۔ مقصود کی تصویریں انہی ناشر کے پاس رہ گئیں جن سے سال گزشتہ میں نے کتاب کے حقوق واپس لے لئے۔ تلافی کے لئے قدیم شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھ دیا ہے۔ جن کو زیادہ جستجو ہو، انھیں انگریزی کتابوں خصوصاً آرتھر ویلی کے مقدموں میں بہت کچھ مل جائے گا۔ جدید نظموں کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ یہ فقط اس صدی کی چوتھی دہائی تک کی ہیں۔ ان میں مغربی جدیدیت کا پرتو ہے لیکن چینی روح کے ساتھ۔

میری کوشش یہ رہی ہے کہ ترجمے اصل کے پابند رہیں لیکن شاعری کی رنگ و بو، تاثیر اور رچاؤ سے عاری نہ ہونے پائیں۔ ان میں آپ کو اظہار کے انوکھے پیرایے اور تکنیک کی کچھ بدعتیں بھی ملیں گی۔ خدا کرے اہل ذوق کے نزدیک پسندیدہ ٹھہریں۔

سرورق اور الھڑ چوپان کا نقش دونوں مصوّر اور حسن کار راسے کی عنایت ہے۔ اُدھر جاتا ہے یا دیکھیں ادھر پروانہ آتا ہے۔

اگست ۱۹۶۰ء　　　　ابن انشا

نظمیں

قدیم

ٹھنڈا پربت

(ہان شان کی سترہ نظمیں)

جدید

قدیم

چین کی کلاسیکی شاعری کا قدیم ترین مجموعہ صحیفہ کنفیوش گردانا جاتا ہے۔ موجودہ تحقیق کے بموجب یہ امر مشتبہ ہے آیا کنفیوش کا اس صحیفہ کی نظموں کی تصنیف یا ترتیب سے کوئی تعلق ہے۔ فی الواقع یہ چین قدیم کے عوامی گیتوں، نظموں، داستانوں اور بولیوں کا شیرازہ ہے جو عیسوی دور کے آغاز کے لگ بھگ ہان خاندان کے عالموں نے مرتب کیا۔ موضوع ان منظومات کا دہقانوں کی زندگی ہے یا جنگ آزما سرداروں کے معرکے۔

تانگ دور (۶۱۸ء - ۹۰۶ء) چینی شاعری کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ لی پو۔ توفو۔ پوچیوآئی اور وانگ وی اسی عہد کے مشہور شاعر ہیں، ایک سے ایک خلاق اور متنوع۔ ان لوگوں نے شاہ کی وفاداری اور قوم کی سربلندی کے گیت بھی گائے اور حکام کی بدنظمیوں اور لوگوں کے دکھ سکھ کو بھی موضوع بنایا۔ سُونگ دور (۹۶۰ء - ۱۲۷۹ء) میں شاہی خاندان اور اُمرا میں متعدد پائے کے شاعر پیدا ہوئے۔ اس دور میں قدرے تکلف کی جھلک ہے لیکن بہت سی نظمیں اپنے زمانہ کی عکاس ہیں۔ بعض دیوار چین کی تعمیر، تاتاری وحشیوں کے حملوں اور جنگجو سرداروں کی لڑائیوں کی بازگشت، اور بعض موسموں کے شدائد اور ذاتی دکھوں کی ترجمان۔

ہمارے منتخبات کا زیادہ تر تعلق انہی ادوار سے ہے۔

جگنو سے

بارش میں ترا یہ دیپ جلے
کبھی بجھ نہ سکے

جھکّڑ جو چلے
تری جوت دبے نہیں ــــ اور بڑھے

اے جگنو جا!
اور نیل گگن کو جا کے بنا کہیں اپنا وطن
اے جگنو جا!
اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارا بن

لی پو (۷۶۲ - ۷۰۵)

عروسی کے چھپر کھٹ کا پردہ

جنرل یوہسون (تیسری صدی عیسوی) نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک عمر گزارنے کے بعد اُسے میکے واپس بھیج دیا، کیونکہ وہ خاندان سوما کی ایک لڑکی کی محبّت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اِس الم نصیب نے یہ نظم اسی عالم میں لکھی ہے

اے پردے چھپر کھٹ کے پردے!
بابل کے یہاں سے لائی تھی
مَیں ساتھ تجھے اِس مقصد سے
دنیا کی نگاہوں سے اوجھل
اچھے ہیں کھیل محبّت کے
اے پردے چھپر کھٹ کے پردے

پھر بابل کے ہاں جاتی ہوں
جاتی ہوں تجھے بھی ساتھ لیے
تہ کر کے تجھے رکھ دونگی کہیں
صندوق میں نیچے کپڑوں کے

اے پردے، چھپر کھٹ کے پردے

کلفت کی یہ گھڑیاں کٹ جائیں
اور بھاگ کھلیں تیرے میرے
ایسا بھی کوئی دن آئے گا!
یا چین کے سب دن بیت چکے

اے پردے چھپر کھٹ کے پردے

جوانی

دریا کے کنارے
گھاس اُگی ہے ——— ہری ہری
اور باغ کے اندر
بید کے پیڑ ہیں ——— گھنے گھنے
اک ناری ادھر
جوبن کے نشے میں مست مگن
اک بُرج کی کھڑکی میں ہے کھڑی ——— غمگیں غمگیں
دیکھو تو سہی
گدرایا ہوا تم اس کا بدن ——— گورا گورا
غازے سے ہے، اس کا چہرہ عجب
گلگوں گلگوں
اور ہاتھ تو دیکھو

نرم نرم کومل کومل

یہ رقاصہ تھی
ناچ کیا کرتی تھی کبھی
اب بیوی ہے
اک آوارہ سیلانی کی
اور سیلانی،
کہیں چلا گیا ہے۔ جانے کہاں؟
یہ چوڑا پلنگ، اور تنہائی
جی مانے کہاں ؟

می شینگ (۱۰۰ ق م)

تدفین کے گیت

(۱)

(یہ گیت بادشاہوں اور شہزادوں کی موت پر گایا جاتا ہے)

لہسن کے پتّوں کی شبنم
پل پل سُوکھی جائے
یہ شبنم جو اب اُڑ جائے
کل پھر واپس آئے

لیکن آج لحد میں جس کا
بستر نرم بچھے گا!
گرمی ہو یا پوس کا جاڑا
وہ نہ کبھی لَوٹے گا

(۲)

(یہ گیت عام آدمیوں کی موت پر گایا جاتا ہے)

قبرستاں بھوتوں کی بستی
جنے کنے کا گھر ہے،
مورکھ ہو یا عقل کا پتلا
ایک جگہ بستر ہے،

موت کا راجا سب لوگوں پر
اک سا راج کرے گا
قسمت کا بے درد لٹیرا
کس کو جانے دے گا

قلعے کے جنوب کی لڑائی

قلعے کے جانباز سپاہی
قلعے کے دکّھن میں لڑے
قلعے کے اُتّر کی طرف وُہ
لڑتے لڑتے ختم ہوئے
کون اُن کی لاشیں دفناتا
کوّے سب کو کھا بھی گئے

"کوّوں سے تم جا کر کہہ دو
ہم کو کِسی سے ڈرنا کیا
ہم تو کھلے میداں میں مرے ہیں
قبر کا ساماں کرنا کیا

کوّد ہمیں بتاؤ تم سے
بچ کر ہمیں گزرنا کیا"

گہری ندّی دھیمے دھیمے
اپنی روِش پر بہتی جائے
جو ہڑ کے اندر ہر جانب
کالی گھاس پٹی نظر آئے
ختم ہوئے سب گھوڑوں والے
گھوڑے پھر بھاگے گھبرائے

جنگ نے اک اک کیا رنڈی
کھیتوں میں خالی ہے زمیں
نیاز تمہاری دے نہیں سکتے!
غلہ اپنے پاس نہیں
اپنے شہزادے کی خاطر

تم لوگوں نے جانیں دیں

ہم بس اتنا کہہ سکتے ہیں
کتنا زمانہ آئے جائے
جانیازو یہ ناممکن ہے
کوئی تمہاری یاد بھلائے
صبح کو تم میداں میں گئے تھے
شام کو تم واپس نہیں آئے

نامعلوم (قریباً ۱۲۴ق م)

سُورج مکھی

اِس کا پیتم گیا
دُور تاروں سے دُور
پیت باقی رہی

یونہی سُورج کی اور
دیکھتی رہ گئی
پیاری سُورج مکھی

پیت کا سِلسلہ
ایسے برہم ہُوا
جیسے پانی سے آگ

سینکڑوں آفتیں

لائے گا ڈھائے گا
اس پہ برہا براگ

اس کی قسمت میں ہیں
موسموں کی طرح
نت نئی گردشیں

اس کا پیتم کہیں
ڈھونڈ لیگا نئی
راحتیں، لذّتیں

سپاہی کا انتظار

چانگ آن میں سُندر چندا
کرنوں کا اک جال بچھائے
دھرتی کو چمکائے

بستی کے اُن گنت گھروں کو
کپڑے دھونے کی آوازیں
چھُوآ چھُو ـــــ گونجائیں

اُتّر پچھّم کی جانب سے
سرد پہاڑوں کے اُوپر سے،
پت جھڑ کے برفانی جھونکے
آئیں

۵ شہر کا نام

ہائے یہ تاتاری وحشی
کب ہاریں گے
اور مرا البیلا پیتم!
رن بھومی سے کب لوٹے گا

گڈریا اور چرخے والی دوشیزہ

یہ دو آسمانی ستاروں کے نام ہیں جو ایک دُوسرے
سے محبت کرتے ہیں۔ تاروں کا دریا۔ یا "رُودِ انجم"
سے مراد کہکشاں ہے، جو ان کے ملنے کی راہ میں
حائل ہے ؎

تاروں کا دریا
انبر کے نیچے
بہتا چلا جائے

بہتا چلا جائے
تاروں کا دَریا
اُتر پچھم سے
آئے گڈریا

؎ ضرورت شعری سے پچھم اور دکھن کو غیر مشدّد باندھا گیا ہے ؎

پورب دکھن سے
چرخے کی ناری
کنیا کنواری

تاروں کا دریا
بہتا چلا جائے
چرخے کی ناری
پیتم کو دیکھے
آگے نہ بڑھ پائے
دریا کے اس پار
رستہ کہاں جائے

دونو کی بانہیں
با چشمِ نمناک،

پھیلی ہی رہ جائیں
دریا کے تٹ پر
دونو ٹھٹک کر
روتے بلکتے
آنکھیں سجائیں

ہائے یہ دریا
جس پر نہ کوئی
پُل ہے نہ رستا
دشمن جانی
بچھڑے ہوؤں کا

بانکا گڈریا
روتا ہی رہ جائے

چرخے کی ناری
رستہ نہیں پائے

جانے یہ کب تک
دریا کے تٹ پر
ٹھٹکے رہیں گے
آہیں بھریں گے
رل نہ سکیں گے

ابابیل کا گیت

کس قدر سرد ہے خزاں کی ہوا
اک قیامت ہے آمدِ سرما
پیلے پتوں سے پٹ رہی ہے زمیں
گھاس کا دُور تک نشان نہیں
جمتی جاتی ہیں اوس کی بُوندیں
قافلوں میں جسیں ابابیلیں
پے بہ پے جا رہی ہیں دکھن کو
راج ہنسوں کے غول بھی دیکھو

ایسے عالم میں اے مرے سرتاج
سوچتی ہوں کہ تم کہاں ہو آج

جونہی دشمن کو ختم کر پاؤ
دن بہت ہو چکے ہیں آ جاؤ
دِل غمِ عشق سے فگار ہے آج
چہرہ اشکوں سے داغدار ہے آج

ساز جب میں کبھی اُٹھاتی ہُوں
یا محبت کا گیت گاتی ہُوں
تارِ نغمے کا ٹُوٹ جاتا ہے
ساز ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے
کیسے تم تک پیام پہنچاؤں
حال اپنا تمام پہنچاؤں

چاند آکاش کے جھروکے سے
میری ویران سیج کو جھانکے،

رودِ انجم رواں ہے مغرب کو
رات گزرے گی بھی کبھی تارو

گلہ بار آسماں کی وسعت کا
چرخے والی حسین دوشیزہ
رودِ انجم کے ساحلوں پہ کھڑے
گائے جاتے ہیں ہجر کے نوحے

کیا خبر ان سے کیا قصور ہوا
ایک سے دوسرا جو دُور ہوا
سوچتی ہُوں مگر — خُدا نہ کرے
کیا ہمیں بھی اس آزمائش سے
اسی انداز سے گزرنا ہے؟
تا ابد انتظار کرنا ہے؟

نامعلوم (تیسری صدی عیسوی)

ے اس سے پہلی نظم کا نوٹ دیکھئے!

کوچ

لو سرد اور تیکھی بہنے لگی پورب کی ہوا
لو برف زمیں پر گرنے لگی گالا گالا
تم دل اپنا مجھے سونپ چکے کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے لاؤ ہات میں ہات تو دو
یہ وقت نہ یونہی بیت چلے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دور چلیں، کہیں دور چلیں

(۲)

اُتر کی ہوائیں پل پل چھن چھن تیز ہوئیں
لو چیخیں دھاڑیں برف کے طوفاں چھیڑ گئیں
جب دل اپنا مجھے سونپ چکے کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے لاؤ ہات میں ہات تو دو

یہ وقت نہ یونہی بیت چلے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دُور چلیں، کہیں دُور چلیں

(۳)

ہاں تُو مڑ نے کچھ صُورت لال نکالی ہے
پر ڈار تو اُڑتے کوّوں کی وہی کالی ہے
تم دل اپنا مجھے سونپ چلے کیا سوچتے ہو
لو چرّخ چُوں رتھ بڑھ بھی چلا اب آ بھی چُکو
یہ وقت نہ یونہی بیت چلے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دُور چلیں، کہیں دُور چلیں

کنفیوشس

اوائل خزاں کی سردی کے بارے میں

پت جھڑ کی رُت آ بھی چکی ہے
جاڑا بڑھتا جائے
ٹُھنٹھ بنا ہر پیڑ کھڑا ہے
شاخوں کو پھیلائے

دریا پر اُتّر کی طرف سے
سرد ہوائیں آئیں
اور بطیں سب جھُنڈ بنا کر
دکھّن کو اُڑ جائیں

میرا گھر ہے سیانگ یانگ کی
جھیلوں کے دامن میں

چھوُ کے بادل دور ہیں کتنے
سوچ رہا ہوں من میں

اجنبیوں کے دیس میں بیٹھا
کب سے نیر بہاؤں
گھر کی یادیں آفت ڈھائیں
کیسے جی بہلاؤں

دُور اُفق پر مانجھی کوئی
بادبان لہرائے
مجھ کو اسی ساحل پر چھوڑے
کشتی کھیتا جائے

رات کے سائے پھیلے جائیں
گھاٹ پہ ویرانی ہے

رستا کون بتائے مجھ کو
میں ہوں یا پانی ہے

مینگ ہاؤ جان
(تانگ دور)

وادی کے اُس پار

میں دُشمن کے ہاتھ میں قیدی
پل بھر چین نہ پاؤں
بھوک سے ہڈی پسلی نکلی
ضعف سے جھکتا جاؤں
دُشمن مجھ کو کیا دیتا ہے
کیا پہنوں کیا کھاؤں

بھائی مرے کی بات نہ پُوچھو
دولت کا متوالا
گھوڑے اس کے گھی کھاتے ہیں
تگڑا پیسے والا

وہ چاہے تو آج ہی لوگو
دو توڑے بھجوائے
اپنے ماں جائے بھائی کو
صاف چھڑا لے جائے

نامعلوم (پہلی صدی ق م)

لی لنگ

لی لنگ اور سوڈو دونوں ہنوں کے دیس میں قید تھے۔ انیس سال کے بعد سوڈو کو رہا کر دیا گیا۔ جب سوڈو نے لی لنگ کو ساتھ چلنے کو کہا تو وہ اٹھ کر ناچنے لگا اور یہ گیت گانے لگا:

سینکڑوں کیا ہزاروں ہی فرسنگ سے
ریگ زاروں کی راہوں سے ہوتا ہوا
اپنے شہزادۂ نامور کے لیے
ندّیاں چیرتا منزلیں کاٹتا

مَیں تو آیا تھا اِس دُور کے دیس میں
ہُن قبیلوں کی تادیب کے واسطے
میرا رستہ ہی دشمن نے رکوا دیا
میرے تیر اور تلوار، ہی چھن گئے

میرا لشکر ہی سارا فنا ہو گیا
میرا شہر ہی یکسر ہوا ہو گیا

میری ماں کو مرے ایک مدت ہوئی
اپنے شہزادۂ نامور کے لئے
لڑنے مرنے کی ہے آرزو آج بھی
واپسی کا مگر راستہ بھی ملے؟

خزاں میں کشتی بانی

مَیں اپنے ہلکے ڈونگے میں
بے پایاں مسرُور
آگے ہی بڑھتا جاتا ہوُں
دُور — برابر دُور

پیڑوں کی نیلی شاخوں میں
جنگل کے دامن میں کوئی
مندر دیکھ رہا ہُوں

اَور ذرا پیچھے دیکھوں تو
ندّی کے پتھر کے پُل کے
بُرج نظر آتے ہیں

چرواہوں کے بَیل اور مینڈھے
گھاس بھرے میدانوں میں چرتے
آگے بڑھ جاتے ہیں

کھریں پلٹے گاؤں کے اندر
بولی کیا کیا پنچھی بولیں،
کبھی سارس، کبھی مَینا

مَیں گھر واپس آ جاتا ہوں
اَور اک جام چڑھا جاتا ہوں
شام کی آدم خور ہوَا کی،
مجھ کو فکر نہیں ہے
مجھ کو فکر نہیں ہے

لوپُو (۱۲۰۹ - ۱۱۲۵ء)

ایک سفر

برسوں ہوئے مَیں ایک دن
گھر سے نِکل کر چل دیا
پر پیچ راہیں کاٹتا
پورب کے ساگر تک گیا
اور اس سے آگے دُور تک
ناگن سی لہراتی ہُوئی
حدِ افق پر اک سڑک
نظروں سے اوجھل ہو گئی

موجوں کے طوفاں تھے ادھر
رستہ مرا روکے ہُوئے

آیا تھا میں اس دیس میں
لاچار ہو کے بھوک سے
پھرتا رہا پردیس میں
ہر سمت روٹی ڈھونڈتا
تھوڑا ہی کافی تھا مجھے
لیکن نہ وہ بھی مل سکا

پھرنا پرائے دیس میں
سودا پڑا مہنگا مجھے
واپس چلا آیا ہوں میں
بے کار رہنے کے لئے

نادِ چُین

لویانگ کے کھنڈرات

ساؤچن ساؤ ساؤ کا تیسرا لڑکا تھا، جب تک اس نے ایک حملے میں غلطی نہیں کی وہ باپ کو بہت محبوب رہا۔ اس نظم میں وہ لویانگ کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے واپس آتا ہے۔ جہاں وہ ایک زمانے میں رہا کرتا تھا۔ اس شہر کو تنگ چاؤ نے تباہ کر دیا تھا۔

(۱)

چڑھ کے پی منگ کی پہاڑی پر
شہر لویانگ کی طرف دیکھوں
شہر لویانگ ہے اداس اداس
جیسے جنگل میں قریۂ افسوں،

محل ایک ایک جل کے راکھ ہُوا
سونے کھنڈرات ہیں در و دیوار
جھاڑیاں اگ رہی ہیں باغوں میں
دامنوں سے اُلجھ رہے ہیں خار

آشنا کوئی اپنے وقتوں کا
اب کہیں بھی نظر نہیں آتا
جائیں کس سمت ان خرابوں میں
کوئی ہوتا تو راہ بتلاتا

(۲)

جھاڑ جھنکار سے پٹے ہیں کھیت
ان میں اب ہل نہیں چلے گا کبھی
اتنے دن ہو گئے ہیں بچھڑے کو
بھول بیٹھا ہوں یاد گلیوں کی

سُونا سُونا ہے دُور تک منظر
کتنے بد زیب ہیں کھُلے میداں
اب نہ رونق ہے مرغزاروں میں
اور نہ چولھوں سے اٹھ رہا ہے دُھواں

آج اُس گھر کی یاد آئی ہے
جس میں اتنے برس گزارے ہیں
لب پہ چُپ لگ گئی ہے غم ہے محیط
تھام کر دل کو رہ گیا ہُوں مَیں

ساؤ پچن
۲۲-۲-۱۹۲ء

سی چوں کا نوحہ

۱۱۰ ق م کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ ایک چینی شہزادی سی چوں کو بعض سیاسی مصالح کے ماتحت وسط ایشیا کے بادشاہ کنگ موسے بیاہ دیا گیا جو ووہسون کا تاجدار تھا۔ جب وُہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر بڈھا ہے وہ سال بھر میں صرف ایک بار اس کے پاس آتا اور وُہ دونوں اکٹھے شراب کا ایک پیالہ پی لیتے تھے، وہ ایک دوسرے کی زبان تک نہ جانتے تھے۔ اس لئے آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکتے تھے:

کالے کوسوں دُور کے اِس دیس میں جانے
بابل نے کیا سوچ کے بیٹی کو بیاہا
ووہسُون کے بادشاہ کے پلّے باندھا
گلے کا پھندا بن گیا ماں باپ کا چاہا

محل ہے مجھ بد بخت کا — نمدے کا خیمہ
کھانا کچا گوشت ہے۔ روؤں اور کھاؤں
گھوڑی کا وہ دُودھ دیں — پی لو یا چھوڑ دو
بھٹکوں اپنی سوچ میں اور راہ نہ پاؤں

دل پر بھاری درد کا اِک پتھر رکھے
سوچوں کیسے دیس میں بابل کے جاؤں
جنگل کی اے کاش میں پیلی سارس بن کے
اڑ جاؤں اک بار، اور واپس نہ آؤں

طوطا

ملک انام سے طوطا آیا
تحفے میں
آدم کی وہ بولی بولے
میٹھی نرم
اور لوگوں نے اس کے ساتھ
وُہی کیا جو وِدوانوں سے
پڑھے لکھوں سے
میٹھی بولی بولنے والوں سے دُنیا میں ہُوا کیا ہے

موٹی موٹی تیلیوں والا پنجرہ لے کر
بند کیا طوطے کو اندر
لے اب بول'
لے اب بول'

نامعلوم

فلسفی

جو بولتے ہیں وہ کیا جانیں
جو جانتے ہیں وہ کب بولیں،
یہ قول ہے لوزو دانا کا

اچھا تو ہم نے مان لیا
یہ لوزو عارف و دانا تھا
پر یہ تو کہو کیوں اس نے لکھی
یہ پوتھی سینکڑوں صفحوں کی

لوزو

طوفان

آسمان پر
آوارہ آوارہ بادل. گشت لگائیں
تھمی ہوئی بارش کی بوندیں
ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ نرم زمیں پر گرتی جائیں
آٹھوں کوٹ میں
اندھیارا چھاتا جاتا ہے
بارش سے میدان اور ندیاں ایک ہوئے ہیں

پورب کی کھڑکی میں بیٹھا
مے کا پیالا
گھونٹ گھونٹ پیتا جاتا ہوں

دور دور تک
نا کوئی کشتی　　نا کوئی گاڑی
اور مَیں بیٹھا
یاروں کی رہ دیکھ رہا ہُوں

(تاؤ چین سنہ ۲۷۳ء)

ایک پہاڑی جھونپڑی میں خزاں کی آمد پر

خالی پربت
تازہ بارش کے چھینٹوں سے
بھیگ رہا ہے

پت جھڑ شام کے اندھیارے سے
ہولے ہولے نکلی ہے
بڑھتی آتی ہے
دور صنوبر کی شاخوں میں
چاند کا چہرا ڈول رہا ہے
اُجلی ندی
اونچی نیچی گھاٹیوں میں بہتی جاتی ہے

بانسوں کے جھرمٹ میں بیبل[1]
بول رہا ہے
کیا کہتا ہے ؟
سکھیوں کی اک ٹولی
اک چشمے میں نہا کر ،
بستی کو واپس آتی ہے

مانجھی کی کشتی کے نیچے
پھُول کنوَل کا
دائیں بائیں ڈول رہا ہے
پھولوں کی رت کی جو خوشبو
ٹھنڈی آہیں بھرتی رخصت ہو جاتی ہے
کون اسے روکے
— یہ کہاں واپس آتی ہے

وانگ وے ی (تانگ دور)

---

[1] ایک پرندے کا نام

تنہائی

شام کا وقت ہے دیکھو تو سُنہرا سُورج
کِس طرح گاؤں کی گلیوں میں چمکتا ہے ابھی

میری تنہائی کا عالم — مرے رنجُور خیال
اور یہ ویران سڑک جس پہ مسافر بھی نہیں
صرف پت جھڑ کی ہوائے غمگیں
سونے کھیتوں سے مری سمت چلی آتی ہے

(نامعلوم)

شبِ سرما

میرا بستر اُداس اور خالی
نیند آئے تو کِس طرح آئے
آج کچھ اَور بڑھ گئی سردی
جان نِکلے ہوا کے جھونکوں سے

آج پھر خوابگہ کے پردوں میں
سُن رہا ہوں میں سرسراہٹ سی
یہ ہوَا ہے کہیں۔ کہ شور کناں
لہریں چڑھتے ہُوئے سمندر کی
کاش لہریں ہوں یہ سمندر کی
کاش یہ میرے پاس ہی آئیں
اور مجھے لیکے ۔۔ میرے بجرے میں
تم جہاں ہو وہیں پہنچ جائیں

شہنشاہ چین وُو تی
(چھٹی صدی عیسوی)

ایک سہانی رات

یوں گھاس پہ اوس بچھی تھی
جیوں برکھا سانجھ سمے کی

وہاں مجھ کو ملا متوالا
میری روشن آنکھوں والا

پیتم جیالا

ہوئی بات پہ بات سہانی
کٹی گھاس پہ رات سہانی

ہوئی صبح تو لیا سنبھالا
گیا روشن آنکھوں والا

پی متوالا

مینگ چیانگ نیو کا نوحہ

(ایک بارہ ماسہ)

اس نظم کی بنیاد ایک داستان پر ہے جو دیوارِ عظیم کی تعمیر سے متعلق ہے، مینگ چیانگ نیو کے شوہر وان چی لیانگ کو بیگاری مزدوروں میں بھرتی کرکے دیوارِ عظیم کی تعمیر کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ مدت تک اس کی کوئی خبر نہ آئی تو مینگ بہت مضطرب ہوئی اور اس کی تلاش میں تنہا روانہ ہوگئی، اس داستان میں یہ مذکور نہیں کہ اسے اپنا شوہر مل گیا تھا یا نہیں ؟

(۱)

لو نیا سال آیا بہاریں لئے
آج آنگن بھی پھولوں سے بھرپور ہیں
آج ہر گھر کے در پر ہیں روشن دِیئے
لوگ خوش بخت ہیں، لوگ مسرور ہیں
ہر طرف ہر جگہ تازگی چھا گئی
جنوری آ گئی

آج پُر نور ہے بستی کا ہر خانداں
ایک میرا ہی دِل زار و مہجور ہے
وہ اُن کو لے گئے ہیں وہ بیگار میں
اب وہ دیوارِ اعظم کا مزدور ہے
میرے دل کو یہاں بے کلی کھا گئی
جنوری آ گئی

(۲)

فروری آئی ہے
اور دامن میں لائی ہے خُوبانیاں
چڑیاں آنے لگیں
اور دکھن کی جانب کی دیوار پر ،
ایک اک کر کے ڈیرے جمانے لگیں
گھونسلوں کو سجا کر دُلہن کی طرح
اُن کے جوڑے تو گلگشت کرنے لگے
بڑھ گیئں میرے دل ہی کی ویرانیاں
فروری آئی ہے

(۳)

مارچ آیا ہے — پیغام لایا بھی ہے
پر وہ میرا نہیں
آرزوؤں میں نئے پھول آنے لگے
لوگ قبروں پہ کاغذ جلانے لگے
قبر اس کی مگر،
سرد و ویران ہے — اب بھی سنسان ہے

۱؎ چین میں ایک رسم ہے۔

(۴)

اپریل آ گیا
اور خوش فکرے ہر سُو ٹہلنے لگے،
اپریل آ گیا
اور ریشم کے کیڑے نکلنے لگے
لوگ چننے کو شہتوت کی پتّیاں
ٹوکری اپنی اپنی اٹھا کے چلے
مَیں تو دو چار پتے ہی چُن پائی تھی
بِین بادوں کے اشکوں سے دھندلا گئے
صبر جاتا رہا
اپریل آ گیا

(۵)

لو مئی — آگیا
بارشوں کا مہینا مئی آگیا
بیر پک بھی چکے
اب اناروں کے پھلنے کے دن آگئے
ہر طرف ہر کہیں
بالیاں نرم پودوں کی لہرا گئیں
میرے کھیتوں میں تو
سرکنڈوں کے سوا
اور کچھ بھی نہیں

(٦)

جُون آیا ہے
اب گرمیاں بڑھ گیئں
لو کنول بھی کھِلے
کیڑوں بھنگوں کے گاتے ہُوئے قافلے
اُڑتے پھرنے لگے
جسم چھلنی ہوا، خوں سِمٹنے لگا
جانے کیا ہو گیا
میرے پیتم مرے دامن کو چھوڑ دو
ظالمو چھوڑ دو

(۷)

جُون رُخصت ہُوا
اب تو جولائی ہے
اب خزاں میں بہت روز باقی نہیں
سردیوں کے لیے
لوگ کپڑوں کو پھر ٹھیک کرنے لگے
ان میں نیلے بھی ہیں
ان میں کالے بھی ہیں
لال بھی، سبز بھی
میری خالی ہے کپڑوں کی صندوقچی
اور ستمبر کی ایسے میں یاد آئی ہے
ماہِ جولائی ہے

(۸)

ماہِ آگست میں ، گُل بدست آگیا
تیج پات آکے گلشن کو مہکا گیا
ہنس آنے لگے
چِٹھیاں خوش نصیبوں کی لانے لگے
اَور بے فِکرے گاؤں کے چوپال میں
سارا دن بیٹھ کر گپ اُڑانے لگے

یہ مہینہ بھی یُونہی گزر جائے گا
اِس کی پوشاک کوئی نہ پہنچائے گا

(۹)

گُل داؤدی اپنے جلو میں لئے
پھر ستمبر کے پُر کیف دِن آ گئے
لوگ تازہ شرابوں سے سرشار ہیں
اور تنہا ہُوں مَیں
اپنے پیستم بنا
مجھ سے کب یہ پیالے پئے جائیں گے
آج تنہا ہُوں مَیں

(۱۰)

ماہِ اکتوبر آیا ہے، سارے کسان
کوٹنے ہیں لگے دھان کی پولیاں
اور مالک لگان آ کے لینے لگے،

چکّی ہر گھر میں آٹے کی چلنے لگی
میرے گھر میں مگر
دھان چھڑنے کا چوکا ہے خالی ابھی

(۱۱)

برف کے گالے پھر چار سو چھا گئے
یعنی پھر وہ نومبر کے دِن آ گئے
آپ ہی جاؤں گی
واں کو اُس کی پوشاک پہنچاؤں گی
جنگلوں اور پہاڑوں کے کوّے مجھے
راہ بتلائیں گے

اور مَیں روتی ہوئی
زیرِ دیوارِ اعظم پہنچ جاؤں گی

(۱۲)

لو نومبر گیا
اور مہینہ دسمبر کا پھر آ گیا
قربِ نَوروز ہے
اور آلوچے پھولوں سے بھرپور ہیں
لوگ مسرور ہیں
اپنی بھیڑوں کی، گلّوں کی قربانیاں
لوگ دینے لگے
میرے دل کو مگر چین آئے کہاں
آج تنہا ہوں مَیں
آج آنکھوں سے میری ہیں آنسو رواں
آج تنہا ہُوں مَیں

وہی گوری جو مرے من میں ہے!

پُورب کے بڑے دروازے سے
یوں گوریاں اُمڈیں باندھ پرے
جیوں بادل ساون بھادوں کے
کوئی آتی ہے، کوئی جاتی ہے
پر مجھ کو تو ایک لبھاتی ہے
وہی گوری جو مرے من میں ہے

پُورب کے مناروں کے نیچے
ناریں ہیں کہ تختے کلیوں کے
بے چین نہیں دل سب کے لیے
بس ایک کلی للچاتی ہے
اک گوری من کو لبھاتی ہے
وہی گوری جو مرے من میں ہے

ٹھنڈا پربت

یعنے

ہان شان کی سترہ نظمیں

ہان شان آٹھویں نویں صدی عیسوی کا ایک چینی شاعر ہے۔ وہ پہلے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ پھر ان سے لڑائی ہو گئی اور وہ اپنی بیوی اور خاندان کو تج کر جہاں تہاں بھٹکتا پھرا، آخر تارک الدنیا ہو کر ہان شان (بمعنی ٹھنڈا پربت) پر ڈیرے ڈال دیئے اور خود بھی اسی نام سے مشہور ہوا۔ ٹھنڈا پربت اس کی نظموں میں ہر جگہ پہاڑ کے نام یا تخلص کے طور پر نہیں بلکہ ایک باطنی کیفیت، سکون و استغنا کے معنوں میں بھی آیا ہے :

(۱)

مرے ابّا اماں مرتے ہوئے
بڑے کھیت اور باڑیاں چھوڑ گئے
پھر اوروں کے باغوں بغیچوں کا
کیوں لالچ آئے جی میں مرے

مری بی بی ہے بیٹھی کرگھے پر
اور کرگھا چیخے چرّخ چوں
مرے بچوں نے دھوم مچائی ہے
وہ کھیلتے ہیں میں دیکھتا ہوں

لو پھولوں کو ناچ نچانے کو
اب تالیاں پیٹ رہے ہیں سبھی
اب ٹھوڑیاں رکھ کے ہتھیلیوں پر
سننے لگے تانیں پنچھیوں کی!

اس حال میں اپنے ملنے کو،
کوئی آتا ہے؟ ہاں آتا ہے
اِک اپنا دوست لکڑ ہارا
اِس راہ سے ہو کر جاتا ہے

(۲)

دیواروں پہ کڑیاں ڈالی ہیں
کڑیوں پر پیال جمائی ہے
اک جھونپڑی مَیں نے گھنے بن میں
ندیا کے کنارے بنائی ہے

یہاں مچھلیاں جل میں اُچھلتی ہیں
پرندوں نے راس رچائی ہے
اِس در پہ کوئی گھوڑا گاڑی
کب آتی ہے، کب آئی ہے

ننھے کو اٹھائے باہوں میں
پھل پھول پہاڑ کے لاتا ہوں
پھر بی بی کو اپنے ساتھ لئے
میں کھیتوں میں چلا جاتا ہوں

مل جل کے نرائی کرتے ہیں
ہرے دھان کی دو نو۔ وہ اور میں
اس گھر میں مرے کچھ اور نہیں
بس ہم ہیں — چند کتابیں ہیں

(۳)

جب عمر مری کچّی تھی ابھی
بڑے بھائی کے ساتھ میں رہتا تھا
ہر وقت تھا کام کتابوں سے
اک دن ہوئی بات، نہ جانے کیا
سب لوگوں کے کوسنے سہنے پڑے
مری بی بی نے بھی منہ پھیر لیا

اس روز سے جگ میں بھٹکتا ہوں
گر آج یہاں ہوں تو کل ہوں وہاں
اِس جگ کی کاسنی مٹی کو
اس روز سے چھوڑ چکا ہوں ہاں

اب بھی میں کتابیں پڑھتا ہوں
اب بھی مرا کام کچھ اور نہیں
اس بات کی کھوج میں رہتا ہوں
کوئی داتا جو مل جائے کہیں،

اک بوند بہت مجھے پانی کی
کوئی کامنا اور نہیں من میں
میں چھوٹی سی زربل مچھلی ہوں
کسی بہلی کے کسی باہن[1] میں

[1] باہن - کچی سڑک پر گاڑی کے پہیوں سے گہری لیک پڑ جاتی ہے
جس میں برسات میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔

۴

تم لوگوں نے مجھ کو چھوڑ دیا
اے عقل کے پُتلو اے سیانو
اور تم سے میں آپ ہی دُور رہا!
اے پاگلو، مُورکھو، دیوانو
مَیں سیانا نہیں، دیوانا نہیں
مجھے پاس تمہارے آنا نہیں

جب رات اترتی ہے جگ میں
مَیں چاند کو گیت سناتا ہُوں
اور صبح کو چڑھتے بادلوں کی
سنگت میں نرت دکھاتا ہُوں

یہ بات تو مجھ سے نا ہو گی!
ہاتھوں کو باندھے ہونٹ سئے
بیٹھا رہوں اور دن بیت چکیں
مرے بال ہوں کالے سے دھولے
اے عقل کے پُتلو اے سیانو
اے پاگلو، مُورکھو، دیوانو

(۵)

اکثر کوئی آ کر پوچھتا ہے
کِس اور یہ ٹھنڈا پربت ہے
کِس راہ پہنچتے ہیں راہی

اِس پربت کی کوئی راہ نہیں
گرمی کے دنوں میں بھی اس کی
کبھی برف پگھلتی نہیں دیکھی
بس ابر کا سایا رہتا ہے
یا کُہرا چھایا رہتا ہے

تم پوچھو گے پھر بس کیسے
اِس کوہ پہ آن بسا لوگو
مرا من ہے بھلا تم سا لوگو

تم لوگ اگر مجھ سے ہوتے
مرے پاس یہاں رہتے ہوتے
مرے پاس — اِس ٹھنڈے پربت پر

۶

کڑے کوس ہیں ٹھنڈے پربت کے

لمبے لمبے

ندّی کے کنارے پتھریلے

چٹیل چٹیل

پنچھی کی صدا چہکار یہاں

غٹر غٹر

آدم کا نہیں تا دُور نشاں

پربت ویراں

چہرے پہ ہوا کے تھپیڑے ہیں

شپ شپ شپ شپ

اور برف ہے گرتی کپڑوں پر

رپ رپ رپ رپ

بن سورج دیکھے کٹتے ہیں

یہاں دن پر دن

ترساتی ہے رُت پھولوں کی

برسیں گن گن

۷

مَیں ٹھنڈے پربت کا راہی
اس راہ کا کٹنا سہل نہیں

یہ وادی کتنی لمبی ہے
یہ رستہ کتنا چٹیل ہے،
یہ ندّی کتنی چوڑی ہے
یہ جھاڑیاں اُلجھی اُلجھی ہیں
یہاں بارش ہو یا سُوکھا ہو
یہاں کائی پہ پاؤں پھسلے گا
یہاں پون چلے یا بند رہے
یہ پیڑ ہمیشہ پہنچیں گے

پھر کون بھلا چل کر آئے
مرے ساتھ اس پربت پر بیٹھے
آرام کو تیاگ کے سادھو بن
سب چھوڑ کے دُنیا کے بندھن

۸

اِس دھند میں لپٹے پربت پر اک تیاگی سے
جب مَیں نے کہی کچھ من کی کتھا (بیراگی سے)
اُس شخص نے راہ دکھا کے دیا مجھ کو جھٹکا
اُس اور — جہاں ہے چاند کا گول دیا لٹکا

۹

رُت بدلی — غم اور دُکھ کا پچھلا سال گیا
اب رنگ ہیں ساری چیزوں کے اُجلے اُجلے
اب دن ہیں بہار کے آئے تو مل کر ہنستے ہیں
ہرے جوہڑوں کے آئینوں میں سب گل بوٹے

اس گھاٹی پر جو پیڑ ہیں نیلی دُھند میں گم
سب ناچ رہے ہیں جیسے بسنت میں مٹیارں[1]
ہے تتلیوں، مکھیوں، مچھلیوں کو بس ایک ہی دُھن
ان پنچھیوں کی ہر وقت پڑے سُنیں چہکاریں

[1] جوان عورتیں

سب ساتھی ہیں یہ میرے سدا کے ساتھی ہیں
یہ سوچ کے مجھ کو شام سے لے کر صبح تلک
خوشیوں کے مارے پل بھر نیند نہیں آتی

۱۰

دنیا کے لوگ جو ہان شان کو دیکھتے ہیں
یہ کہتے ہیں — یہ شخص کوئی دیوانا ہے
اس شخص کے اوپر نام کو روپ سروپ نہیں
تن ڈھکنے کو بس چیتھڑوں کا اک بانا ہے
جو ہم کہتے ہیں اس کی سمجھ میں نہیں آتا
جو یہ کہتا ہے ہم سے نہیں سمجھا جاتا

تم لوگ کہ دن بھر گشت لگاتے رہتے ہو
کسی روز جو خود ہی ہان شان کو آ دیکھو

۱۱

کبھی کبھی جب تنہا بیٹھا ہوتا ہوں
اک درد کی کیفیت اَن بوجھی اَن جانی
اک بے چینی سی — دِل کو آن ستاتی ہے
تب ساری پہاڑی بادلوں میں گھِر جاتی ہے
اور سرد ہوا
وادی کے دہانے پر سسکاریاں بھرتی ہے
اک بندر آکر ٹہنیوں کو لچکاتا ہے،
اک پنچھی آکر بکھی ہانک لگاتا ہے
اور وقت کے ہاتھوں کالے بھورے بالوں پر
ہر روز سپیدی کی تہ چڑھتی جاتی ہے،
یہ سال گیا
سکھ چین گیا پامال — گیا
اب پیری زنگ جماتی ہے

۱۲

پچھلے سال اِنہی دِنوں
جب بہار کے پرند،
گا رہے تھے زمزمے
آئی تھی اسی طرح
اپنے بھائیوں کی یاد
اور اب کے سال بھی
جب فسردہ ہو چُکے
پھول شاخ شاخ کے
لوٹ آئی ہے وہ یاد

ندّیوں کا آبِ سبز

سِسکیاں سی بھرتا ہے
اور پھر چہار سُو
چھا چلا سیاہ ابر

سو برس تو جی چُکا
مَیں جو اَور بھی جیا
شہر چانگ آن کی
یاد جب بھی آئے گی
دل کو چیر جائے گی

۱۳

میں نے رات اک سپنا دیکھا
یہ سپنا کہ میں اپنے گھر لوٹ گیا ہُوں
بی بی میرے کرگھے پر بیٹھی بُنتی ہے
اک لمحے کو رک جاتی ہے
جیسے کوئی بات پرانی یاد آتی ہو
پھر جو ہاتھ اٹھاتی ہے تو
یوں لگتا ہے جیسے اُس کی
باہوں میں کچھ دم نہ رہا ہو

میری جو آواز سُنی تو
پل بھر یونہی
اجنبی اجنبی نظروں سے مجھے لوٹ کے دیکھا

وہ کیا جانے کون آیا ہے
ہم لوگوں کو بچھڑے جگ بیتا، جگ بیتا

یہ وہ دن تھے
کنپٹیوں کے بال مرے
پکّے نہ ہوئے تھے

۱۴

میں انتیس برس سے یُونہی
ٹھنڈے پربت پر ڈیرے ڈالے بیٹھا ہُوں
کل جو گیا مَیں
اپنے دوستوں اور بیگانوں سے مِلنے کو
تب معلوم ہوا کہ آدھے
موت کے چشموں کی راہوں میں کھوئے گئے ہیں

زندگی جلتی شمع کی صُورت
گھلتی ہے — گھلتی جاتی ہے
ندی ہے یہ جس کا پانی
ایک روش پر بہتا ہے — بہتا آیا ہے

آج فقط یہ سایہ میرا
ساتھی ہے — اور میں حیرت سے
آنسو کی دو بوندیں امڈی دیکھ رہا ہوں

۱۵

اک بھولے بسرے دَور کی بات سناتا ہُوں
اس بات کو اب تو ایک زمانہ گزرا ہے
اک گھر تھا سج دھج جس کی سب سے نرالی تھی
یہاں ناخوں کے تھے پیڑ، وہاں آلوچوں کے
جو راستوں پر دو سمت بہار دکھاتے تھے
اور نیچے بہتی ندّی کے سُندر تٹ پر
کہیں سوسنی تھی، کہیں اور انوکھے پھُول کھلے
اس ندی کنارے گوریاں کیا کیا آتی تھیں،
کوئی اطلس میں کوئی ریشم میں ملبوس مگر
اک گوری تھی جو اپنے من کو بھاتی تھی
اُس گوری کا سبز اور چمکیلا بانا تھا
یوں ہم لوگوں نے اک دُوجے کو جانا تھا
میں اُس کو بلانا چاہتا تھا پہ بلا نہ سکا
نا ہونٹ ہلے نا میری زباں نے ساتھ دیا

۱۶

پربت کی سب سے اُونچی چوٹی پر بیٹھا
دیکھ رہا ہُوں دُور تلک، بڑی دور تلک
مَیں تنہا ہوں اور لوگوں کو معلُوم نہیں،
میں اس پربت پر ڈیرے ڈالے بیٹھا ہُوں
جو ہر[1] کے ٹھنڈے پانی کے آئینے میں
اک تنہا چاند کا چہرا چھب دکھلاتا ہے
پر جوہر کا یہ چاند تو اصلی چاند نہیں
اک چاند ہے۔ اور وہ اوپر نیلے امبر پر
میں تم کو گیت کے اک دو بول سناتا ہوں
پر گیت میں کوئی زین[1] نہیں — کوئی زین نہیں

---

[1] کسی لڑکی کا نام معلوم ہوتا ہے۔

۱۷

موت اور جیون کا جو علم جاننا چاہو
برف اور پانی کی یہ کہانی کافی ہوگی
پانی جم کر سخت ہوا اور برف بنا
برف نے پانی میں پھر بدلا رُوپ اپنا
جو شے مَرتی ہے پھر پیدا ہوتی ہے
ہر جیتی شے مَوت کی گود میں سوتی ہے
برف اور پانی باہم کیا نقصان کریں،
مَوت اور جیون دونو کا ہم مان کریں

جلد

خزاں

وادی میں پیڑوں کے گرانے کی آوازیں
گونج رہی ہیں
کتنی کھیتی کاٹ چکی دہقاں کی درانتی
تھک بھی گئی ہے
ٹوکریوں میں ہندوانے اور جھاڑوں کے پھل
بھرے گئے ہیں
پت جھڑ کی رُت اوس کے موتی
بکھراتی ہے —— پھر آتی ہے
—— دہقاں کی کھیتی کا جگر کاٹ رہی ہے

پھینک رہے ہیں دریاؤں میں جال مچھیرے

ہاتھ لگیں گے پیڑوں کے سوکھے ہوئے پتّے
بوڑھے مانجھی ہولے ہولے ناؤ کھیتے!
گھر کو رواں ہیں — ان کی جھونپڑیاں اور خیمے
دھند کی اک چیتّی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں،
پت جھڑ کی رُت
ملاحوں کی ناؤ کے چکّر کاٹ رہی ہے

کھلی چراگہ میں جب ٹڈّے چلّاتے ہیں
اس کی ویرانی کو اور بڑھا جاتے ہیں
ندّی کی تہ سے جو پتّھر جھانک رہے ہیں
ندّی کے اُجلے پانی کو چمکاتے ہیں!
چرواہوں کی بنسریاں خاموش ہوئی ہیں
ایسے میں یہ لوگ کہاں کھوئے جاتے ہیں

گرمی کی راتوں کی خوشبو
کہاں گئی ہے
چیڑا ہی کی آنکھوں میں
پت جھڑ کی اُداسی
اونگھ رہی ہے

(ہوچی فینگ)

ایک رات کا منظر

شہر کے ہنگامے دِھیمے پڑتے جاتے ہیں
جیسے جزر میں بحر کی موجیں
ساحل کی ریتی کو نمایاں کرتی پیچھے ہٹ جاتی ہیں

ایک اِک گھر میں
سرد سلیٹی چھتوں کے نیچے
کِتنی رُوحیں خوابیدہ ہیں

آخری گھوڑا گاڑی گزرے عمر ہُوئی ہے

محل کے باہر
محنت اور کلفت کے مارے

کچھ دکھیارے
ٹھنڈی پٹڑی پر لیٹے ہیں
——— اونگھ رہے ہیں

اِن میں سے کوئی
آدھی رات کو اٹھتا ہے ———
اور اپنے ساتھی سے کہتا ہے
مَیں نے کِسی کا نالہ سُنا ہے
اُس اُونچے ویران محل کے پیچھے والے
گنبد ہی سے
جس میں اب کوّے ہی شب بسری کرتے ہیں
کبھی یہ نالہ، پاس آتا ہے
کبھی یہ دور چلا جاتا ہے

اُس کے کا ہل ساتھی کی بات اور عجب ہے

وہ کہتا ہے
میں ان پتھر کے شیروں کو
سرِ شام سے اشک بہاتے دیکھ رہا ہوں
کوئی مسافر ٹھنڈی سانسیں بھرتا یونہی گزر جاتا ہے
رات کی نرم ہوا کا جھونکا
قلعے کی چھت کے اوپر کی
سُوکھی گھاس ہلا جاتا ہے

(ہو چی چنگ)

سُرخ رنگ دھوؤ نہیں

ٹھنڈے پانی کے جوہڑ میں
دھوبی کپڑے دھوئیں
چُھوا چھو چِلّائیں

نِرمل پانی، اُجلا پانی کانپے اور تھرائے
کِس کے کوڑے کھائے

مَیں ڈھیلے بازو لٹکائے
کب تک کھڑا رہوں گا
نیلے جل کے پھولوں میں سے
کِتنے توڑ سکوں گا!

کومل رنگ رنگیلے کپڑے

دھوپ[1] میں اور برکھا میں ڈھل کر
پھیکے پڑتے جائیں
ان کے ساتھ بہاروں کے دن
اور خوشیوں کے سائے
ختم ہوئے، مرحبا سے

کیا اپنے سندر سپنے بھی
یونہی دھوکا دیں گے
خالی خواب رہیں گے؟

پتھرو۔ دھوبی کی موگریو
پت جھڑ کا موسم آیا ہے
لکڑی کے پل پر سے گزرتے
پالے کی تپلی تہ میں سے
میرا سایہ کانپ رہا ہے

(ہوچی نینگ)

---

[1] دھوپ اور بارش زندگی کی تلخ حقیقتوں کے مظاہر ہیں جو خوابوں کی رنگت کو دھوڈالتے ہیں۔

تربت کے پھول

(جو ننھے لنگ لنگ کی قبر پر چڑھائے جانے والے ہیں)

اُن پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھو
جو گھاٹی پر کھلتے ہیں، مُرجھا جاتے ہیں
اوس کے اُن قطروں کی آب و تاب کو دیکھو
جن کی یادیں اکثر لوگ بھلا جاتے ہیں
ننھے بچے تم کتنے قسمت والے تھے
وہ ندی آئینہ صفت اُجلی ہوتی ہے
جس میں کسی کا مٹیالا سایہ نہ پڑا ہو

ننھے تم نے سپنوں میں اک دُنیا دیکھی
اپنی کھڑکی پر چڑھتی بیلوں کو دیکھا

اپنے بالوں میں سجتے پھولوں کو دیکھا
چھجے سے گرتی مینہ کی جھالر کو دیکھا
تم ان بوندوں کی باتوں میں کھو جاتے تھے
تاروں کی کرنوں پر موہت ہو جاتے تھے

دل سے تمہارے دکھ اور درد کی گرد کو دھونے
آنکھوں سے اکثر جو نیر اُمڈ آتے تھے
نیر نہیں ہوتے تھے چمکیلے موتی تھے!

جیون کے وہ دن کتنے اچھے تھے لیکن
جیون کے ان دنوں میں ہم نے درد بھی پایا
موت کا لمحہ ان سب سے بڑھ کر سندر تھا

(ہوچی فینگ)

پت جھڑ

پت جھڑ آئی
نیل گگن خاموش ہُوا
ایسے میں کیا بات کرے
من ہے چپکا

اکتا جاؤں
پھر اپنے گھر واپس آؤں
پھر بجنی پر جھک جاؤں
اور نیر بہاؤں

(لن کینگ)

وداعِ بہار

رات کے وقت جب سنسناتی ہُوئی
لُو درختوں میں سیٹی بجانے لگے!
کوئی پنچھی کہیں چہچہانے لگے
میری کھڑکی کے باہر کے میدان سے
سونے والوں کا اک شور آنے لگے
کوئی رونے لگے، کوئی گانے لگے

آدمی —— ایسا محسوس ہونے لگا
جیسے خالی ہَوا میں اُڑا جا رہا ہو
رات تاریک ہے رات خاموش ہے
بانس کے سائے کیوں کپکپانے لگے!

مٹھی بھر لو تو کچھ ہاتھ آئے نہیں
ایک احساس ہے، (اور وُہ جائے نہیں)
جیسے ہر چیز دنیا کی پہنائی کی
پنکھ پھیلائے اَور اُڑ کے جانے لگے

چاندنی رات ہے
اور جنگل کی ویرانیوں سے کہیں
ایک جھینگر کی آواز آنے لگے۔
لو ہوا ناچنے کسمسانے لگے
اور چناروں کے بربط بجانے لگے
لو خزاں آ گئی
لو بہاروں کے دِن بھی ٹھکانے لگے
لو خزاں آ گئی

(لن کینگ)

سُرخ سایہ

شام ہوئی ، چمگادڑ ہر سُو
چکّر کاٹ رہے ہیں
چیخیں مار رہے ہیں

لال بھبوکا سُورج
دُور دور پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے
پل پل ڈوب رہا ہے

آخر اس سنسان فضا میں
مَیں کیوں گھوم رہا ہُوں

مجھ کو تو معلوم نہیں ہے

میرے دل کو
کیسا چہرا
کیسی سُندرتا بھاتی ہے

(لن کینگ)

بچپن کی یادیں

بارہا اکیلے میں
ایک ننھے بچّے کے
نرم نرم پاؤں کی
چاپ پاس آتی ہے

لیکن اس طرح کہ پھر
بیکراں خموشی میں
جلد کھو بھی جاتی ہے

عالمِ بہار کی
جھیل میں یہاں وہاں
ایک دو نہیں، ہزار

عکس نظر آتے ہیں

شام کے دھندلکے میں
پیڑوں کی قطاروں کی
درمیانی راہ پر
کوئی اجنبی امید
کوئی اجنبی خیال
بس اڑا ہی جاتا ہے

ہاں یہ ایک بادپا
کابلی پتنگ ہے
جو فضائے شام کی
ڈوبتی ضیاؤں میں
پیرتا ہی جاتا ہے

لن ینگ

ایک گلی کا منظر

دُور گلی کے اک کونے میں
آدھی شب کو
لمپ کی روشنیوں کے حلقے
مدھم مدھم
اونگھ رہے تھے

کھڑے ہیں ہر پیڑ کی شاخیں
لپٹی ہوئی تھیں
راہی رستے بھول رہے تھے

"اے پاپی کیوں ساتھ مرے یہ ظلم کمایا"
روتی رہی وہ، کوئی جواب آنا تھا نہ آیا

اب جو ہوا پیڑوں کی پھنگیں چھو کر گزری
کومل کومل گھائل گھائل پتّے مَیں نے
پھڑ پھڑ پھڑ پھڑ
دھرتی پر گرتے ہُوئے دیکھے

(سوچ ہو)

کس کے بغیر

کس قدر سرد ہے خزاں کی ہوا
پیلے پیلے اُداس سے پتّے
میرے آنگن میں پھڑپھڑاتے ہیں
جیسے اُونچی فضاؤں کے پنچھی
کسی نادیدہ تیر کے گھائل
ننگی دھرتی پہ لوٹ جاتے ہیں
رُوپ فانی ہے، رنگ فانی ہے
زندگی کی امنگ فانی ہے

ایک دیوار پر سجیلی بیل
راہ و رسمِ وفا نبھاتی ہے

چند پیلے سے داغ دل پہ لئے
آندھیوں کے تھپیڑے کھاتی ہے
آہیں بھرتی ہے روئے جاتی ہے
زندگی سے گزر رہی ہوں میں
دکھ تمہارا ہی بھر رہی ہوں میں

ہائے میرے لئے بیچلی بیل
اس قدر دکھ اٹھا رہی ہے کیوں
کتنی بے درد ہے خزاں کی ہوا
جب بھی آئے تباہیاں لائے
کس طرح آخری سنبھالے تک
اس سے ڈرتا ہے زندگی کا دیا
لو خزاں موت بن کے آ بھی گئی
بیل اس کا فریب کھا بھی گئی

تین تارے ہری نگاہوں سے
خالی آنگن کو تک رہے ہیں خموش
کس قدر مضمحل ہے آج کی رات

سسکیاں ہیں نہ کوئی نالہ ہے
ہر طرف ہے اتھاہ خاموشی
میں ہوں اور میرا دل ہے آج کی رات

پیلے پیلے اُداس سے پتے
سرد مٹی میں دفن ہو بھی چلے
جانے کس کی جُدائی میں بیٹھا
وقفِ حرمان و رنج و یاس ہوں میں
آج تنہا ہوں میں اداس ہوں میں

(مو بہ مو)

برف کا گالا

برف کا مَیں اک گالا ہوتا
موج اُڑانے والا ہوتا
ایک اک منزل ایک اک رستا
میرا دیکھا بھالا ہوتا
فر فر فر فر خیر برادر
میں تو چلا نیچے دھرتی پر

مَیں نہ کسی وادی میں جاتا
اور نہ کسی ویراں گھاٹی پر
میں نہ کہیں گلیوں میں بھٹکتا
آوارہ سا اِدھر اُدھر ا

فر فر فر فر دیکھ نہ بھائی
میری بھی اک منزل ٹھہری

اونچی رنگا رنگ فضا میں
آن بان سے گھوما کرتا
سجنی کی بگیا میں جا کر
سجنی کی رہ دیکھا کرتا
فر فر فر اس کے تو ہر سُو
ناچتی ہے اک بھینی خوشبو

تب میں یونہی اڑتا اڑتا
اس کی چولی کو سہلاتا
اس کے سینے کی لہروں میں
اپنے من کا منشا پاتا
ان کومل لہروں میں آخر
گھل جاتا۔۔ بس گھل ہی جاتا (سوچہ موڑ)

ایک دلِ آشفتہ سے

ازل میں عالمِ امکاں کا جب ظہور ہُوا
تو روشنی بھی صف آرا تھی اور ظلمت بھی
پہاڑیوں پہ چمکتا ہے آفتاب مگر
اُجالتا ہوا فرشِ گیہ کی قسمت بھی
جہانِ کہنہ کو تم اس قدر بُرا نہ کہو

غریب کو تو ہے غم ہی متاعِ عشرت و عیش
خوشی بشر کے تصرّف سے کوئی دُور نہیں
خوشی ہے ایک خزینہ ضمیرِ انساں میں
کسی سے شکوہ شکایت کوئی ضرور نہیں
جہانِ کہنہ کو تم اس قدر بُرا نہ کہو

(چین مینگ چیا)

سمندر

صبح سے میں جوہڑ کے کنارے گھوم رہا تھا
پانی میں اک پھول سجیلا چتر لگائے
ایک نرالی آن بان سے جھوم رہا تھا

آیا پون کا جھونکا تو لہرا کر بولا
"جیت سمندر سے میں کبھی صورت نہ کروں گا"

سن کے بات کنول اس کی مسکا کر بولا
الھڑ ساتھی تجھ کو یہ معلوم تو ہوگا
تیرے سمندر میں بھی اک دن پھول کھلے گا

(یفنگ فی ینگ)

بارش کی رات

آدھی رات کا عالم
اس میں
اُلجھی اُلجھی رم جھم رم جھم
ایسے میں گمبھیر خموشی
اور ہوئی گمبھیر

سوچوں کے یہ تانے بانے
پہلے ہی سے اُلجھے ہوئے تھے
اور بڑھا اُلجھاؤ

(ریونیگ پو)

ماضی کا صحرا

پیرِ درماندہ کی طرح محزوں
اپنے ماضی پہ ڈالتا ہوں نگاہ
ہر قدم پر بسیط صحرا، ہیں
کوئی چشمہ کہیں نہ برگ و گیاہ

چونک اٹھا ہوں خوابِ ہم سے
کس کی آواز سُن رہا ہوں میں
آسماں پر تھکے کوترے،
شام کے ساتھ چھائے جاتے ہیں

رپہلی کرنوں سے ڈوبتا سورج
بام و دیوار جگمگاتا ہے

جیسے بیمار کوئی برسوں کا
کوئی اندھا سا آئینہ تھامے
اپنی پرچھائیوں کو حیرت سے
دیکھتا جائے، سوچتا جائے
گال میرے کبھی گلاب سے تھے

(ابائن چہ لی)

کیسے کیسے لوگ

"بنگ تانگ ہو لو" کی ہانک لگا کر پھیری والا ٹھہرا
گرد کے اک لقّے کو نگل کر چل نکلا پھر چُپکے چُپکے
نیلے آسماں کے نیچے پھٹے پھٹے بھولے پنچھی
یونہی چکّر کاٹ رہے ہیں آگے پیچھے آگے پیچھے

پنجرہ اک پنچھی کا تھامے ایک بچارا سودائی سا
دم لینے کو پل بھر ٹھہرا دیتی کی سی راہگزر پر
اور ادھر ویران گلی میں ایک اکیلا الھڑ لڑکا
کیا جانیں کیا سوچ رہا ہے راہ کے بیچوں بیچ ٹھٹک کر

ایک طرف اک مُولیوں والا خوانچے میں دُکان سجائے
ایک جہاں سے غافل بیٹھا کھلا ہوا چاقو لہرائے

پہلے سورج کی کرنوں میں چمکیں کیا کیا چیزیں اس کی
اور ادھر ویران گلی میں الھڑ لڑکا سوچے جائے

ایک جنم کے بونے نے بھی اپنا لمبا سایہ دیکھا
ترچھی کرنوں کے جادو پر جی کو یوں بہلانے لگا ہے
"میں اتنا ٹھنگنا تو نہیں ہوں، دنیا کیوں مجھ پہ ہنستی ہے"
جانے وہ البیلا لڑکا کیسی باتیں سوچ رہا ہے

بھات کا ایک پیالا بیچ میں رکھے چند کمیرے بیٹھے
ٹھنڈی آہیں بھرتے جائیں، جینا راس نہ آئے سائیں،
نیند میں کوئی بے سُدھ لیٹا ہذیانی ہنکار رہا ہے!
(جانے اس نے کیا دیکھا ہے سپنوں میں کیا شکلیں آئیں)
کسی نے اس کے بالوں میں اک پھول گلابی ٹانک دیا ہے
جیسے برفیلے میداں میں ڈوبتے سورج کی پرچھائیں

(بائن چہ لن)

پل کے اوپر

بچپن کے وہ دن تم کو بھی یاد تو ہوں گے
دریا کے ساحل پر ہم کھیلا کرتے تھے
ننگے پاؤں شبنم کو روندا کرتے تھے
اور فضا میں اُڑتے ہوئے بادل کے ٹکڑے
سُن کے ہمارے گیتوں کو جھوما کرتے تھے

قوس قزح کو دیکھ کے تم گایا کرتی تھیں!
پورب میں بادل نکھرا ہے، دھنک کھلی"
اس کے بعد ٹھٹک کر یونہی ہنس دیتی تھیں

پوُچھا کرتیں "یہ جو دھنک ہے، پُل تو نہیں ہے؟"
جس کی ایک کماں پھیلی ہے
آسمان کے اِس کونے سے
اُس کونے تک

مَیں کہتا تھا ہاں یہ دھنک ایسی پلیا ہے
جو انسانوں کو جنت میں پہنچاتی ہے
اک دن جب ہم اب کی طرح بچّے نہ رہیں گے
مِل کے دونو اس پلیا کو پار کریں گے"

تِیس سال پہلے کی یہ ساری باتیں ہیں
قسمت دیکھو ہم دونو پھر آج وہیں ہیں
آج دھنک ہے اور نہ بادل نظر آتے ہیں
حدِ افق تک کھیت خزاں کے لہراتے ہیں

تم مجھ سے اب پوچھ رہی ہو "دریا کا پُل
آسمان کی قوسِ قزح ایسا تو نہیں ہے؟"

مَیں چپ ہوں — کیا بولوں ہم دونو اِس پل پر
ہاتھ میں ہاتھ دیے آگے بڑھتے جاتے ہیں

(لی کوانگ تئین)

ایک شام

دن خزاں کے ہیں کیا اداس اداس
اونچی اونچی سپید دیواریں
ڈھلتے سورج کی زرد کرنوں میں
آئینہ بن کے جگمگاتی ہیں
زرد اور گول پنکھ پتّوں میں
ٹوکیاں بھی ہری بھری دو چار
ایک جھونکے پہ جھوم جاتی ہیں

جس طرح کوئی دیر کے بچھڑے
دوست کی خیر کی خبر لائے

لیکن الفاظ کتنے مبہم ہیں
وہ بھی دو چار سے زیادہ نہیں

نقش ہوں دوستوں کے چہروں کے
یا تبسم کی یاد ــ یا آواز
سارے مانوس یاد پڑتے ہیں
ہائے افسوس کیا ہوئے وہ لوگ
آج جن کا پتا نہیں ملتا

کس کا گھر ہے وہ کس کا دروازہ
جس کے اندر کسی مسافر نے
اک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی
اور پھر چل دیا ہے چپکے سے
عمر بھر کی تھکن کا بار لئے

اب تو سورج بھی چھپ گیا شاید
چند پنچھی - ہزار ہا بھنگے ——
شام کے اس سرمئی دھندلکے میں
اڑتے پھرتے ہیں اس طرح جیسے
بس یہی کچھ رہا ہو شام کے پاس
دن خزاں کے ہیں کیا اداس اداس

دلی کوانگ تن

دھوبی کا گیت

دلی اور لاہور میں چینی عام طور پر موچی کا کام کرتے ہیں، کراچی میں قریباً سبھی دندان ساز ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں جو چینی بستے ہیں وہ عموماً کپڑے دھونے کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ جو چینی طالب علم امریکی یونیورسٹیوں میں حصولِ تعلیم کے لئے جاتے ہیں، اُن سے بھی اکثر یہی سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تمہارا باپ دھوبی ہے؟ دین یی تو جو اعلیٰ تعلیم کے لئے شکاگو آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہتا ہے —— مجھے تو یہ پیشہ واقعی پُراسرار اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

کپڑوں کو چٹّے کافور بھی کرنا ہو گا
بھیّا ہو !
کپڑوں کی شکنوں کو دور بھی کرنا ہو گا
بھیّا ہو!
گنتا جاؤں -- اِک، دو، تین —

آنسوؤں سے تر رُومالوں کو دھو دونگا
کرتُوتوں سے پاپوں کے داغ چُھڑا دُونگا
گندے سے چٹّے برّاق بنا دُوں گا
تیل کے گندے دھبّوں والے کپڑے لاؤ
لاؤ ہوس کی کالک والے کپڑے لاؤ
کیچڑ والے سیلن والے کپڑے لاؤ !
لاؤ دھو دُوں میں سارے کپڑوں کو دھو دُوں
لاؤ دھو دوں میں سارے داغوں کو دھو دوں

بھٹی پر پیتل کی دیگ چڑھی رکھی ہے
اس کے دھوئیں سے رہ رہ کر جی متلاتا ہے
خون میں بھی یہ گندی بو رچتی جاتی ہے
لیکن گندی چیزوں کو دھونا ہی ہو گا
گندی چیزوں کو گندا کیوں چھوڑا جائے
اجلی چیزیں آخر گندی ہو جاتی ہیں،
لاؤ پھینکو، مَیں سارے کپڑے کو دھو دوں
لاؤ پھینکو مَیں گندی چیزوں کو دھو دوں

دھوبی کے پیشے کو تم گندہ کہتے ہو
کہتے ہو دھوبی کا پیشہ پاک نہیں ہے
کیا دنیا میں چیزیں ہی گندے ہوتے ہیں؟
مجھ کو تمھارے پادریوں نے بتلایا ہے
عیسےٰؑ کے ابا بھی نجاری کرتے تھے
تم لوگوں کا اس پر کیا ایمان نہیں ہے؛

پانی اور صابن سے کیا کچھ ہو سکتا ہے
کپڑے دھونا فوجیں لڑوانا تو نہیں ہے
جنگی بیڑے میداں میں لانا تو نہیں ہے
مَیں نے مانا یہ کچھ اچّھا کام نہیں ہے
کپڑوں سے لوگوں کے پسینے دھوتے جاؤ
اُن کی خاطر آپ ہی گندے ہوتے جاؤ
لیکن ہمّتی بتاؤ تم یہ کام کروگے؟
ہاں ہاں ہمّتی بتاؤ تم یہ کام کروگے؟

بجلی کی تیزی سے وقت اڑا جاتا ہے
اس پر اک آنسو کی بُوند ٹپک جاتی ہے
کام جو آدھی رات تلک چلتا رہتا ہے
دھوبی خانے کا یہ دیا جلتا رہتا ہے
یہ تو تمھارا کام نہیں ہے اس پیشے کو
گندہ کہ دو، نفرت کی نظروں سے دیکھو

تم یہ دیکھو کپڑے سارے صاف دُھلے ہیں
تم یہ دیکھو داغ تو سارے چھوٹ گئے ہیں
تم یہ دیکھو کوئی شکن باقی تو نہیں ہے؟
اور اگر باقی ہو —— تم چلنی کو پکڑو
چلنی سے کہ دو یہ کپڑا صاف نہیں ہے

آنسوؤں سے تر رُومالوں کو دھو دونگا
کُرتوں سے پاپوں کے داغ چھڑا دونگا
گندے سے چٹے بُرّاق بنا دوں گا
تیل کے گندے دھبّوں والے کپڑے لاؤ
لاؤ ہوس کی کالک والے کپڑے لاؤ!
لاؤ دھو دوں میں سارے کپڑوں کو دھو دوں
لاؤ دھو دوں میں سارے داغوں کو دھو دوں

کپڑوں کو چٹّے کافور بھی کرنا ہوگا

بھیّا ہو !

کپڑوں کی شکنوں کو دور بھی کرنا ہوگا

بھیّا ہو !

گنتا جاؤں ــ اک ، دو ، تین

دیپ بی تو

ققنس کا راگ

کرموجو

ققنس ایک اساطیری پرندہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس کے مرنے کا وقت آتا ہے وہ سوکھی لکڑیوں کی چتا بنا کر اس پر بیٹھ جاتا ہے اور دیپک راگ گاتا ہے، راگ کی تاثیر سے لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور ققنس اس میں بھسم ہو جاتا ہے، اس راکھ پر مینہ برستا ہے۔ تو اس سے پھر ققنس پیدا ہوتا ہے، چینی ادبیات میں اس کا مماثل فینگ اور ہوانگ کا جوڑا ہے۔ جو لال گپھا میں رہتا ہے، فینگ نر ہے اور ہوانگ اس کی مادہ۔ فینگ کی آواز چی چی۔ چی چی مشہور ہے اور ہوانگ کی ژو ژو۔ ژو ژو

کو موجو نے جو چین کے سربرآوردہ ترین شعرا میں گنا جاتا ہے (آج کل وہ عوامی جمہوریہ چین کا نائب صدر ہے) یہ نظم ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ لکھی تھی، اس دور کی نظموں میں یہ اس کی مشہور ترین نظم ہے۔ انجامیہ گیت وحدت الوجودی فلسفے کی یاد دلاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آگ کو روحِ حیات کے علامیے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور واحد اور جمع فرد و کائنات اور انسان و نوعِ انسان کی نمائندگی کرتے ہیں:

اِبتدائیہ

سال کے چل چلاؤ کے دن ہیں
فینگ اور ہوانگ کا رحسیں جوڑا
محو پرواز ہے فضاؤں میں
دَردِ حسرماں کی راگنی گاتا
خس وخاشاک ٹہنیاں سوکھی
چار جانب سے جمع کرتا ہوا

سوکھا چشمہ ہے ایک پہلو میں
ایک جانب ہیں پیڑ مرجھائے
اک طرف ایک بحر بے پایاں،
چادرِ آب ہی نظر آئے

اک طرف ایک بیکراں صحرا
دامنِ ریگِ زرد پھیلائے
کوہ و وادی پہ برف پھیلاتا
کوئی جھونکا کبھی گزر جائے

ریشوں اور ٹہنیوں کا ڈھیر لگا
ڈھل گیا آفتاب شام آئی
فینگ بھی ماندگی سے چُور ہُوا
ہوانگ بھی لڑکھڑائی، تھرّائی
مضمحل اور نڈھال ہیں دونو
تاب باقی ہے نے توانائی
قلّۂ کوہ پر اُتر آئے
رت نزدیک تو سرک آئی

فینگ کے بے قرار ٹھونگوں سے
ٹہنیوں سے شرار اڑنے لگے
ہوانگ نے پنکھ سے ہوا جھل کر
اور بھی تیز کر دئے شعلے
عود و لوباں کے دھوئیں کی طرح
ناچتے چار سُو لپکتے ہوئے
شام کی سُرمئی فضاؤں میں
اڑ رہے ہیں سیاہ مرغولے
فینگ محنت سے چور ہے لیکن
زور ٹھونگوں کا بڑھتا جاتا ہے
ہوانگ کی کاوش مسلسل سے
شعلہ اٹھتا ہے، پیچ کھاتا ہے
اک معطّر غبار چوٹی کو
دامنِ نور میں چھپاتا ہے

آگ کی لال لال لپٹوں سے
سارا ماحول جگمگاتا ہے،

آ رہی ہیں سگندھ کی لپٹیں
گیے پہر رات کٹ چکی ہو گی
ہوانگ کے پنکھ تھک کے سُست ہوئے
فینگ میں بھی تواں نہیں باقی
موت کو انتظار تھا کب سے
آج نزدیک تر سرک آئی
پنچھیو! زندگی سے دیگرو
منزلِ اضطراب ختم ہُوئی

قُلّہ کوہ پر اِدھر سے اُدھر
ہوانگ کیسے جھوم جھوم کر ناچا
دردمند اور اداس لہجے میں

فینگ نے اپنا راگ چھیڑ دیا
اور جب ہوانگ کا چھڑا نغمہ
فینگ سے نے رقصِ موت دکھلایا
دشت و صحرا سے پنچھیوں کا گروہ
گرد اُن کے ہجُوم کر آیا!

فینگ کا گیت

چی چی — چی چی
چی چی — چی چی

یہ دنیا لوہے سے ٹھنڈی
یہ دنیا کالک سے کالی،
میلے خون سے بڑھ کر گندی

اے دنیا اے اندھی دُنیا تیرا مصرف کیا ہے
کس منزل سے آئی ہے تو کس منزل جانا ہے

تو ننھی سی دھرتی ہے   یا کوئی جہاں بے پایاں
اے مٹی کے تودے میں ہوں   کیا کیا سوچ پریشان

یہ دُھندلی دھندلی سی فضائیں   جن میں تو لپٹا ہے
کب سے ہیں اور کہاں سے آئیں   اِن کے آگے کیا ہے

تو جو عالم بے پایاں ہے   کوئی ہمیں سمجھائے
یہ نیلا آکاش یہ بادل   کس دنیا سے آئے

جیون تیری گود میں کانپے   کیسی تو دنیا ہے
کل ہے جانِ جگر سے خالی   یا جھوٹی مایا ہے

سوچتے سوچتے آسماں کی طرف
اپنی حیران نظریں اٹھاتا ہوں میں
آسماں پُرغرور اور نادان ہے

اس سے مایوس ہو سرگراں سرنگوں،
حال دھرتی کو اپنا سُناتا ہُوں میں
پر یہ دھرتی بھی مُردہ ہے بیجان ہے

جب سمندر سے اپنی حکایت کہوں
اس کو مصروفِ گریہ ہی پاتا ہوں مَیں
اس کی دنیا بھی اشکوں کا طوفان ہے،

یہ بھیانک جہاں، یہ غلاظت نشاں
سچے ہیرے کی تلوار کو بھی یہاں
خوفِ زنگار ہے

اے جہاں اے جہاں
تجھ پہ نفرین ہے
اے قصائی کے مذبح

غلاظت کے پیپ اور خوں کے مکاں
تجھ پہ نفرین ہے

غم کا زنداں ہے تو
یا کہ شمشان ہے،
چیختے دھاڑتے جس میں بھتنے رہیں
اک جہنم ہے تو
ناچتے ہانپتے جس میں شیطاں لعیں
تیری منزل ہے کیا
تیرا مصرف ہے کیا
تجھ پہ نفرین ہے

سوئے مغرب جو پرواز کرتے ہیں ہم
دیکھتے ہیں وہی آہنی بیڑیاں

ارضِ مشرق میں جا کر اُترتے ہیں ہم
وہی زنداں وُہی قیدیوں کے مکاں
ہم نے دکھن کی جانب اگر رُخ کیا
تو یہی مقبرہ اس طرف بھی مِلا
اور جو اتّر کی جانب اڑے تو ہمیں
دکھ کے دوزخ کا کرنا پڑا سامنا

اے جہاں اے جہاں
کب تلک یُونہی فریاد کرتے رہیں
جس کی موجیں ہیں دن رات نوحہ کناں
اس سمندر کا بہرُوپ بھرتے رہیں

ہوانگ کا گیت

زو زو — زو زو
زو زو — زو زو

پانچ صدی سے آنسو روئیں
کام ہے نالے کرنا
جیسے شمعِ محفلِ ویراں
یا جنگل کا جھرنا

زندگی اپنی دنیا میں یُونہی کٹی
جیسے تاریک شب کا یہ خواب ہو
اس سے پہلے بھی تھی نیند اور آج بھی
نیند کا راج ہے دوستو! دوستو!

زندگی سانس بن کر جو اُوپر اُٹھی
تو دُھواں بن گئی اور کہیں کھو گئی
ایک موجِ صبا کی طرح آئی تھی
چاپ بن کر فضاؤں میں گم ہو گئی

نیند اول بھی ہے
نیند آخر بھی ہے
اور اس نیند کے درمیاں زندگی
ایک بیدار لمحے کی مانند ہے
اور کچھ بھی نہیں اور کچھ بھی نہ تھی

شعلے اٹھنے لگے!
شعلے بڑھنے لگے
اور خوشبوئیں ہر سُو بکھرنے لگیں
زیست کی ساعتِ واپسیں آ گئی
من کے اندر کی چیز د

تمہیں الوداع
تن کے باہر کی چیز دو
تمہیں الوداع

الوداع ! الوداع !

نئی زندگی کا گیت

ا۔ مُرغ سحر کی بانگ

صبح کا ریلا بڑھتا آئے
صبح کا ریلا بڑھتا آئے
جوت جو اندھیاروں میں گھلی تھی
پھر جاگے پھر جیون پائے
صبح کا ریلا بڑھتا آئے

پھولوں پر جوبن آتا ہے

پھولوں پر جوبن آتا ہے
دنیا کا مرجھایا چہرا
آج نئی رونق پاتا ہے
پھولوں پر جوبن آتا ہے

جیون لہریں بڑھتی آئیں
جیون لہریں بڑھتی آئیں
فینگ ہوانگ جو بھسم ہوئے تھے
پھر جاگیں پھر جیون پائیں،
جیون لہریں بڑھتی آئیں

۲- فینگ اور ہوانگ کا گیت

تن پایا ہے، من پایا ہے
آج نیا جیون پایا ہے
کُل میں ایک بھی جاگ اٹھا ہے

ایک میں کُل بھی جاگ اٹھا ہے

ہم وہ[1] ہیں
وہ[2] ہم ہیں

تم مجھ میں —— میں تم میں
میں تم ہوں —— تم مجھ میں ہو
آگ ہوانگ ہے
فینگ آگ ہے
اُڑو اُڑو —— اور گاؤ

ہم خوش ہیں — سب بندھن ٹوٹے
سدا جئیں گے — موت سے چھوٹے
ایک میں کُل ہے — وہ بھی امر ہے

---

۱ صیغہ واحد غائب
۲ صیغہ جمع غائب

کُل میں ایک ہے — سو بھی امر ہے
ہم بھی امر ہیں!
میں بھی امر ہوں
وہ بھی امر ہے
آگ امر ہے
تم بھی آگ ہو
میں بھی آگ ہُوں
وہ بھی آگ ہے
آگ آگ ہے
اڑو اڑو —— اور گاؤ

ہم گاتے ہیں — ہم اڑتے ہیں
ہم اڑتے ہیں — ہم گاتے ہیں
کُل میں ایک بھی گیت سنائے
ایک میں کُل بھی گاتا جائے

تم گاتے ہو ؟
مَیں گاتا ہُوں؟
وہ گاتا ہے ؟
آگ بھی گائے؟

گیت گیت ہے
گیت گیت ہے
گیت ہی گیت
گیت ہی گیت
گیت
گیت

رات کے پنچھی

یا دُور کے کھُلے دریچوں میں
کچھ دیپ جلیں
یا ٹڈے ٹر ٹر چلّائیں
میدانوں میں
یا پنچھی ہیں — وہ ایک نہیں ہیں کتنے ہی
جو جلتے جاتے مجھ کو بلاتے جاتے ہیں
'اب آؤ بھی'

آگاش پہ کالے بادل ہیں اور پیڑوں پر
کچھ پات ہیں پیلے پت جھڑ کے، مرجھائے سے
ہیں اندھیارے میں خود کو ڈبوتا جاتا ہوں
میں آنکلا ہوں کتنی دور بھٹکتا ہوا
اور پھر بھی اگلی منزل سے، کہیں آگے سے
اسی ایک صدا کو سنتے دیکھتے پاتا ہوں
'اب آؤ بھی'

لی کوانگ تسِن

ایک پھول کا شکوہ

میں پھول
عنابی پھول ہوں
پھول ہوں ننھا سا
اک تارا ہے میں جس کو ہمیشہ تکتا ہوں
یہ جانتے بھی
یہ جوت مری نہیں ہو سکتی

میں اپنے دل کو جانتا ہوں
اور تاریکی ــــ
اور تنہائی میں چپ چپ اپنے آپ میں رہنا چاہتا ہوں۔
میں روتا ہوں

پر موتی ایسی شبنم بھی
جو آپ بھی جگ کی آنکھ سے چھپ چھپ جاتی ہے
مرے بھید کو جانتی پاتی ہے
اس سناٹے میں مجھ سے سانجھ بٹاتی ہے

میں اس سورج سے ڈرتا ہوں
جو آنے والی کل کی صبح کو نکلے گا
مرے اندیشوں، مری سوچوں، سب سے بے پروا
کچھ لوگ کہیں گے، دیکھو تو
اس پھول کی آنکھیں پھر سے بھیگی بھیگی ہیں۔
مرا چہرہ لال بھبوکا ہے سب جائیں گے
میرے بھید کو لیکن کیسے یہ پہچانیں گے
میں اندر اندر روز یہ دن
کس طور سمٹتا ٹوٹتا گھلتا جاتا ہوں

——— فینگ فی مینگ